حیاتِ قادر

مؤلف

عبید اللہ دُرّانی

باب نمبر ۱۶

آخری دَور

سنہ ۵۹ء میں وہ زمانہ آ گیا جب بابا جان پھول سے بھی زیادہ نازک بچہ سے بھی زیادہ سادہ اور موصوم معلوم ہوتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جسے لطافتوں کو زمانہ کہہ لیں۔ جیسے ہیرے کی جگہ اس کی تابناکی، شمشیر کی جگہ اس کی آب۔ مگر اس لطافت کا اندازہ کون لگائے۔ جب تک خود لطیف نہ ہوں اس لطافت میں اپنی کثافت ہی نظر آتی ہے۔ کل تک جس کو قادر و قیوم کی شان سمجھتے ہیں آج وہی انہیں ایک کمزور و ناتواں بچے جیسی ہستی نظر آنے لگتی ہے۔ اُن کی عقل اور دل پر پَردے پڑنے شروع ہو جاتے ہیں۔ مگر واہ رے بابا کی شان کہ بلند سے بلند تر مقام پر قیام ہونے کے بعد عبدیت کو ہاتھوں سے نہیں دیا۔ پوری تابناکی سے شانِ خداوندی کی برسوں تک جھلک دکھانے کے بعد بھی اس فانی جسم کی ساری شریعتیں پوری کرتے رہے۔ ناگپور گئے تو وہی فرمانبردار فرزند جو والدین کے آگے ادب سے کاندھے جھکائے رکھتے تھے اور خلوص و محبت میں سجدۂ نیاز پیش کرتے ہیں۔ بابا تاج کے لئے بھی کتنا صبر آزمائی کا مقام۔ یہ نقشہ دیکھنا ہو گا کہ وہی کمسن الہڑ بچہ جس کے لکڑی چیرنے کے مشقت کے تخیل سے ان کے ہاتھ میں چھالے پڑ گئے تھے۔ اب سراپا انوار ہو کر لوٹا ہے اور اب حُسن کے سانچے میں پوری طرح سمو جانے کے بعد سراپا جمال بنا سامنے کھڑا ہے۔

سفر ناگپور:

۴ اگست ۱۹۵۹ء کو ۱۸ شخصوں کی معیت میں ناگپور کے لئے روانگی ہوئی۔ قادر نگر سے اسٹیشن تک خلقت ساتھ تھی اور اللہ اکبر، جے قادر بابا، جے نارائن کے نعرے لگاتے جا رہے تھے۔ رائے پور سے گاڑی ناگپور کیلئے بدلی گئی۔ ڈونگر گڑھ اسٹیشن پر پہلے سے اتنی خلقت بابا صاحب کو دیکھنے کو جمع تھی کہ سارا پلیٹ فارم آئوٹر سگنل تک بھرا ہوا تھا۔ گاڑی دو گھنٹہ لیٹ ہوئی۔ ناگپور پہنچے تو بھی بہت لوگ استقبال کے لئے جمع تھے۔ بابا جان لوگوں سے فارغ ہونے کے بعد گاڑی میں ہی آرام فرماتے رہے۔ اس لئے کہ گاڑی ناگپور جا کر رُک جاتی ہے اور پھر یہی دو گھنٹہ بعد واپس جاتی ہے۔ بظاہر سفر کی تھکان کہہ لیں مگر بہ باطن یہ بچے کا ماں کی گود میں پہنچنا تھا۔ زندگی کے طویل سفر کے بعد گھر کو واپسی تھی۔ بابا جان گاڑی ہی میں آرام کرتے رہے اور ادھر اسی گاڑی کے ناگپور سے واپس لوٹنے کا بھی وقت قریب آ پہنچا۔ لوگوں نے دیکھا کہ بابا جان کے جسم میں نہ کسی قسم کی حرکت تھی نہ سانس کی آواز سنائی دیتی تھی۔ بے چینی اور فکر میں خادموں نے پاس ادب چھوڑا۔ اور خود قریب آنے کی ہمت نہ تھی۔ اس لئے بابا کے چہیتے کُتے وزیری کو ڈبہ کے

اندر کر دیا۔ وزیری پیروں میں بھی لپٹا مگر بابا میں نہ کسی قسم کی جنبش ہوئی نہ حرکت۔ خادموں کا شک اب شدت اختیار کر گیا۔ دل تو نہ کہتا تھا کہ ختم فسانہ ہو گیا لیکن شدتِ جذبات سے لوگوں نے رونا شروع کر دیا۔ کس کو کس کا ہوش تھا۔ مگر کسی کا دل نہ مانتا تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ اتنے میں بابا جان خود اُٹھ بیٹھے اور اتنے تازہ دم اور شگفتہ جیسے لیٹے ہی نہ تھے۔ غسل کے لئے پانی مانگا۔ غسل فرمایا۔ خادموں نے جلد جلد کپڑے پہنائے اور ریل سے اس وقت اُتار لیا جبکہ وہ واپس روانہ ہونے لگی تھی۔

بابا تاج الدین اولیا کے مزار پر بابا جان پہنچے تو پہلے سجدۂ نیاز پیش کیا اور شعر پڑھا۔

جنت کا در کھلا ہے تیرے در کے سامنے بیشک خدا کا گھر ہے تیرے گھر کے سامنے

یہ نیاز مندی کچھ اتنی شان اور صداقت سے ہوئی کہ تمام حاضرین کے منہ سے واہ واہ نکل گیا۔ تاج باغ سے شکر دھرا پہنچے تو گیٹ کے اندر داخل ہوتے ہی ایک سادھو نے جو تلک لگائے تھے خیر مقدم کیا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں بابا تاج الدینؒ بیٹھا کرتے تھے ۔ خیر مقدم کیا کی نگاہیں نیچی رہیں اور اس جگہ سجدۂ نیاز پھر پیش کیا۔ یہاں سے سادھو صاحب ساتھ ہو کر تعلیم خانہ، کبوتر خانہ، گھوڑے اور شیر کی جگہ دکھانے لے گئے اور بابا تاج الدینؒ کے رہنے کی جگہ دکھاتے ہوئے رگھوجی راجہ کے محل تک لے گئے۔ محل میں مہارانی نے دودھ کا پیالہ پیش کیا تو بابا جان نے فرمایا اس جگہ پہلے چائے کا پیالہ پیا تھا، اب دودھ کا پیالہ پی رہا ہوں۔ کچھ چکھ کر خادم کو دے دیا۔ پھر فرمایا اسی جگہ بڑے بڑے آئینے میں نے پتھر مار کر توڑے تھے۔ محل سے باہر وہی سادھو لے گئے اور بابا تاج الدینؒ والے کمرہ میں پہنچایا۔ یہاں بابا جان نے پلنگ کو بوسہ دیا۔ پھر اس چبوترہ پر جہاں بابا تاج الدینؒ نے رحلت فرمائی تھی زمین بوس ہوئے۔ وزیری سے بھی گردن سر کے ساتھ ملا دی۔ اس جگہ کے مجاور نے چائے پیش کی تو بابا جان نے فرمایا کہ اُس زمانہ میں چائے میں نمک ڈال کر پیتا تھا اب شکر ڈال کر پیتا ہوں۔ دو ایک گھونٹ پی کر خادم کو دے دی۔ مہارانی نے ایک ریشمی چادر سر پر لپیٹ کر نذر پیش کی اور سادھو بھی کار تک چھوڑ کر چل دیئے۔ یہاں سے سب رخصت ہو کر اسٹیشن گئے اور کچھ دیر آرام کے بعد پھر تاج آباد پہنچ کر مزار مبارک پر دوبارہ قدم بوسی فرمائی اور اس وقت پھر وہی شعر پڑھا۔

تاج آباد سے واپس آکر جبلپور والے نیل کنٹھ بابا کے مزار پر پہنچے۔ ان کے بیوی بچوں نے قدمبوسی کی تو بابا جان نے یاد دلایا کہ ایک وہ وقت تھا جب نیل کنٹھ بابا منہ میں سگریٹ لگائے کبوتر کی طرح لوٹے تھے اور کہا تھا کہ تمہارے میں کیا کمال ہے۔ کیا کمال ہے رات کو ناگپور سے کلکتہ روانہ ہوئے۔ کلکتہ پہنچ کر صرف نئی مارکیٹ چار پانچ منٹ باہر سے دیکھی۔ وہاں جما فقیر کا مزار زیر زمین تھا جس نے کالی کے جادو کو بنگال سے ختم کیا تھا۔ پھر کالی کے مندر کے سامنے سے گزر کر واپس اسٹیشن آگئے۔ بس یہ تھی کلکتہ کی سیر۔ کالی کے پجاریوں نے مندر کے اندر بلایا تو فرمایا کالی کو تو جما فقیر نے پہلے ہی گاڑ دیا ہے۔ مجھے اس کا کیا کرنا ہے۔

سفر آخرت کی تیاری:

سنہ ۵۹ء سے اور کچھ نے اس سے بھی قبل اب ظاہری نشانیوں سے بھی آگے کی باتیں دیکھنی شروع کیں۔ یعنی عالم ارواح میں، بشارتوں میں اپنے یا دوسرے جنازے دیکھنے شروع کئے۔ کچھ نے بابا جان ہی کا جنازہ دیکھا اور کچھ نے ان کا سبز کپڑے میں ڈھانکا جانا۔ الغرض دور دراز کے رہنے والوں کو بھی عالمِ رویا میں بہت عرصہ قبل یہی خبریں دی جانے لگیں۔

آخری زمانے کی شدتِ لطافت یہ تھی کہ کہاں سفر شاذونادر ہی اختیار فرماتے تھے، اب جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ اگست ۱۹۵۹ء میں ناگپور آخری سلام کر آئے۔ شریعتِ جسمانی پوری کی۔ نومبر ۱۹۵۹ء میں جسمانی حالت یہ تھی کہ بہت تکان چہرۂ مبارک سے ظاہر ہوتی تھی۔ کراہنے کی ہلکی ہلکی آواز آتی تھی۔ یہ کیفیت ایکس ال سے بھی زائد رہی۔ مگر اس ماہ میں ہی بارہ روز کے اندر تین مرتبہ ویزا ک تشریف لے گئے۔ ۳۰ نومبر کو اندر کے مکان سے باہر کے کمرہ میں تشریف لے آئے کہ خلقت سے اور نزدیک ہو جائیں اسی دن دربار کے اجلاس میں خوب گھنٹی بجوائی۔ اور فرامیا خوب گائو، خوب گائو ایسا کہ جسم میں عشق کی گرمی آجائے۔ دسمر میں اننت گری سے بھی آگے دور تک سیر کی۔ اور فرمایا۔ اپنی مرضی سے جتنی دور چاہوں جائوں گا و گرنہ جے پور سے واپسی ا اجائوں گا۔ یہ خیال رہے کہ فقیر کا ایک قدم بھی بے معنی نہیں ہوتا ہر سفر جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے ایک رمز ہوتا ہے۔ قدم اس عالم میں اُٹھ رہے ہوتے ہیں اور سیر دوسرے عالم میں ہوتی ہے۔ جب سارا وجود ہی آیت اللہ ہو تو ہر عمل میں ظاہری اور باطنی شریعت الٰہی دونوں ہی پوری ہوتی رہتی ہیں۔ جب بطنِ قرآن میں طبق در طبق مختلف معانی اور اسرار پوشیدہ ہوں تو ام القرآن۔ قرآنِ ناطق ذات میں کیا کچھ اسرار و رموز نہ ہوں گے۔ دسمبر ۵۹ء ہی میں حکم دیا کہ لال میٹے پر جو چھوٹے مکان شکستہ کھڑے ہیں، ان کو صاف کر دو۔ اس جگہ ہم دفن ہوں گے۔ مگر ابھی نہیں۔ ابھی اور رہیں گے۔ ڈرو نہیں۔ پھر ایک روز حکم دیا کہ اس کمرہ کے پیچھے جہاں اب قیام تھا۔ پچاس گز لمبی اور دس گز چوڑی فصیل لگوا دو۔

سنہ ۶۰ء کے آغاز میں کئی بار پاکستان۔ افغانستان۔ بغداد عرب۔ اٹلی جانے کا ذکر کیا۔ اور یہ کہ حج پر جائیں گے۔ فرمایا حج پر جانا کیا۔ ہم یہیں سے دیکھ لیتے ہیں کہ وہاں کیا کیا ہوتا ہے۔ فرمایا لوگ پاکستان جانے کو کہتے ہیں۔ کیا افغانستان بھی جانا ہو گا۔ میں کہیں نہیں جاتا۔ سیدھا پاکستان سے عرب اور واپسی ہوائی جہاز سے بمبئی کے راستہ۔ حج کا زمانہ آیا تو دربار میں تین صفوں میں کثیر تعداد نے معہ بابا جان کے نماز ادا کی۔ فرمایا تم سب کا یہیں حج ادا ہو گیا۔ لکھ دو یہ بات ان لوگوں کو جو ہم کو حج پر لے جانا چاہتے ہیں۔

مارچ ۶۰ء میں بجواڑہ۔ کھم میٹ۔ بورگم پائو تشریف لے گئے۔ اور آٹھ روز کیمپ کیا۔ بے حد ہجوم خلقت کا اور بابا جان کے چاہنے والوں کا رہا۔ ۲۷ جولائی ۶۰ء کو ہوئی جہاز سے حیدر آباد دکن تشریف لے گئے۔ اور ۱۳ اگست کو واپس تشریف لائے۔ اس سفر کے بعد ہی پیرورم کر آئے۔ چلنا پھرنا مشکل ہو گیا۔ پھر بھی سہارا لے کر دربار تشریف لاتے رہے۔

آخری جشن:

گذشتہ سال کے جشن میں فرمادیا تھا کہ اگلا جشن بہت شاندار رہے گا۔ ۳ ربیع الثانی ۱۳۸۰ھ مطابق ۲۴ ستمبر ۶۰ء کو جشن کا دن تھا۔ اور یہاں کچھ دن قبل یہ کیفیت کہ روانگی کی بالکل تیاری سخت طبعیت علیل۔ خدام مغموم۔ آنکھیں آشکبار۔ حضور کا فرمان کہ ہمارا کام ختم ہو گیا۔ اب ہم جاتے ہیں۔ نظروں سے چھپ جائیں گے مگر جاتے کہیں نہیں۔ تمام حساب کے مطابق عین جشن کے دن ہی وصال ہونا تھا۔ جشن کی تیاری دُکھے دل کیا کرتے۔ نہ زبان سے حضور کی رخصت ہونے کا خطرہ ظاہر کر سکتے تھے اور نہ ہی ہاتھ کام کرنے کو اُٹھتے تھے۔ ۲۲ ستمبر کی شام جب ایک عزیز خادم پہنچے تو یہ حالت تھی کہ دوازہ حضور کے کمرہ کا بند تھا اور مجاور صاحب اور دیگر خدام باہر کھڑے رو رہے تھے۔ ان خادم کی رسائی ہوئی۔ دور دراز کے رہنے والے بچے اس چھوٹے سے عبد کو دیکھ کر باپ کی محبت بھی عود کر آئی۔ اپنی، اپنے بچوں کی بازی اگر کوئی لگادے تو شفیق باپ مہربان ہو ہی جاتا ہے۔ وہ کیفیت بابا جان کی آہستہ آہستہ بدلنا شروع ہوئی اور ۲۳ کی شام کو رات گئے طے ہوا کہ جشن منایا جائے گا۔ اور حضور باہر تشریف لائیں گے۔ رات بھر خدام دربار سجاتے رہے اور تیاریاں ہوتی رہیں۔ جشن کی صبح دربار میں وہی سابق روایتوں کے مطابق گہما گہمی ہونے لگی۔ باہر صبح سویرے سے شہنائی کی سریلی آواز شروع ہوئی۔ پھر سے زندگی کی بہار آئی۔ کہیں گانے، کہیں قوالی، کہیں قرآن خوانی۔ مگر تمام میں محبت کے اظہار کی وجہ سے ایک ایکائی۔ ایک ہم آہنگی۔ ہر طرف ایک خوشی کا عالم تھا۔ یہاں تک کہ اپاہج، لُولے، لنگڑے، دلگرفتہ، زمانہ کے زخم خوردہ سب ہی اپنی تکالیف بھول گئے تھے۔ دربار جو کل اداسی کا نمونہ تھا، آج عید کا نمونہ پیش کر رہا تھا۔ دن نکلا تو فدائیوں کا بے پناہ ہجوم۔ ذات پات، مذہب و ملت سے بلند ہو کر ایک یگانہ ہستی بن کر حضور پر پروانہ وار فدا ہونے کے لئے جمع ہونا شروع ہوا۔ آج حضور کو کرسی پر بٹھا کر دربار لایا گیا تھا۔ اور تخت پر پہلی بار کرسی لگادی گئی تھی۔ لوگ آیتہ الکرسی پڑھا کرتے ہیں مگر خوش قسمت آنکھیں آیتہ الکرسی کی تفسیر کو ساتھ ساتھ مادیت کے رنگ میں بھی دیکھتی جاتی تھیں۔ وَسِعَ کُرسُی السمٰوٰتِ والارض کا نقشہ اس آخری جشن کے دوران بار بار پیش نظر رہا۔ حضور علالت کے باوجود پورے صبر کے ساتھ ہر ایک کی دلجوئی فرماتے رہے۔ وہی بہتا دریا حُسن معنی کا۔ جو بھی موتی رول لے۔ مگر کم لوگ ہی ان باتوں کی گہرائی کی طرف دیکھتے تھے۔ پھر بھی دریا کو کیا، کوئی موتی چُنے نہ چُنے۔ وہ اسی طرح رواں۔ ایک شام قبل فرمایا تھا۔ بہت سی مچھلیاں بازار میں آئی ہے۔ مچھے مچھلیاں (مُتلاشیانِ حق) بہت پسند ہیں۔

پاکستان سے جو جماعت ایک نشانی کے طور پر پیش ہوئی۔ اس کی بابت فرمایا۔ دیکھو ہر طرف پشاور ہی پشاور ہے۔ اور دیکھنے والی آنکھوں نے واقعی دیکھا کہ سارا دربار اسی طرف کے لوگوں سے بھرا پڑا تھا۔ اور اسی عالمِ مثال کے مجمع میں ایسے ایسے نظر آئے کہ جو اِدھر نہ تو گئے تھے، نہ ایک ہی شہر کے تھے۔ پھر فرمایا۔ پشاور والے اتنے بڑے کہ ویزا اک والے دیکھ لیں تو ڈر جائیں۔ پشاور کی چائے پکانی بہت پڑتی ہے۔ تب رنگ کھلتا ہے۔ کھانے کے وقت بھی فرمایا۔ سب کھانا لے جائو پشاور والوں کے لئے۔

اس جشن میں پسِ پردہ وہی نقشے چلتے رہے۔ جو گذشتہ جشنوں میں ہوا کرتے تھے۔ مادی دنیا میں بھی اور آفاقی میں بھی۔ ایک خادم کا کہنا ہے۔ آج سپریم کورٹ میں کیش پیش تھے۔ سب ہی میں کامیابی ہوئی۔ یہ عجب رنگ دیکھا کہ دربار لگنے کے بعد اور قدمبوسی سے سرفراز کرنے کے بعد بابا جان کے چہرے پر نکھار آجاتا تھا۔ اور نیاز مندوں کے چہروں پر بھی۔ سب کے سب شادمانی اور کامرانی کی تصویر نظر آنے لگتے تھے۔ وجہ یہ ہے کہ حضور جس وقت دربارِ عام میں جلوہ افروز ہوتے ہیں تو اس لامحدود رحمت کے سمندر سے نسبت اور رشتہ ہوتا ہے اور در کھل جاتے ہیں، اور خدمت کے ذریعہ ہے سیرابی کا۔ دربار لگنے کی صورت یہ رہی کہ دن میں کئی کئی بار تشریف لاتے رہے۔ البتہ زیادہ دیر نہ بیٹھ سکتے تھے۔ یہ بھی ہوا کہ رات کے بارہ بجے جب محفل میلاد ہو رہی تھی تشریف لے آئے۔ اور کئی ایک کی قسمتیں کھل گئیں۔ کچھ لوگوں کے دل میں یہ بھی خیال گزرا کہ ان ہزاروں آدمیوں کے مجمع میں بابا ہمیں کیا پوچھیں گے۔ مگر دیکھنے والا سب کو دیکھ لیتا ہے۔ سب کے قلوب سے واقف ہوتا ہے۔ ایک صاحب نے کہا۔ ایمان اس ہزاروں کے مجمع کو دیکھ کر پختہ ہو گیا ہے کہ کس طرح سب کی خبر لیتے ہیں... ربّ العٰلمین جب یہ کرتا ہے تو یہ آسان ہے۔ شام کی مجلس میں پاکستان سے لایا ہوا کشمیری لباس زیب تن تھا۔ پائوں میں راجپوتی جوتی تھی پائوں سوجے ہوئے ہونے کی وجہ سے جوتی اتار لی گی تھی۔ لوگوں نے اس نعلین مبارک کو سر پر لگانا شروع کر دیا تھا۔ عجب دل ہلا دینے والا نقشہ تھا۔ کچھ اہلِ دل رو دیئے۔ اور کہا کہ قسمت والے لوگ تھے۔ یہ رمز عشق کے کوئی کیا جانے۔ بڑے بڑوں کو راستہ کا پتہ نہیں ہوتا۔ وِرد دے دیتے ہیں۔ یوں راستہ جانے ہوئے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ مہربانی کریں تو راستہ بھی دکھا دیتے ہیں۔ اور مہربانی کریں تو انگلی پکڑ کر ساتھ بھی لے جاتے ہیں۔ لیکن گود میں اُٹھا کر لے جانے والے تاریخ میں کم ملیں گے۔

۲۴ ستمبر کو فرمایا تھا۔ کل بارش ہو گی۔ تو واقعی ایسا ہی ہوا۔ کہ ۲۵ کو اتنی کرم کی بارش کہ بار بار دربار تشریف لائے۔ بار بار خدائیوں کا ہجوم دیدار ارقدمبوسی سے مشرف ہوا۔ اور اپنے دل کی آرزوئیں عرض کرتا رہا۔ عجب شانِ محبت تھی جیسا کہ ماں اپنے بچوں کے لئے بار بار تڑپ کر ان کے پاس آئے۔ انسان کتنا اور اس کی محبت کتنی۔ مگر جب اس عظیم محبت کو دیکھے جو ایک مرکز عالم کو مخلوق سے ہوتی ہے تو کلیجہ پھٹ جائے۔ یہ ساری دنیا کا بوجھ۔ یہ ان کے دکھ درد کا بوجھ۔ یہ ان کی محبتوں کا بوجھ کون برداشت کر سکتا

ہے۔ حق کی محبت کی جھلک، دنیاوی آنکھیں کیا دیکھ سکتی ہیں۔ یہ ان کے وہم اور تخیل سے پرے کی بات ہے۔ یوں شام کو خوب بارش بھی ہوئی۔ بجلی بھی کڑکی اور کئی بار اندھیرا ہو کر روشنی آگئی۔

۲۶ ستمبر کو ویزاک کا سفر فرمایا۔ ۲۴ آدمی ساتھ تھے۔ یہ سفر کچھ ایسا ہی ہوتا ہے جیسے گودی میں اُٹھا کر منزلیں طے کرائی جارہی ہوں۔ فرمایا آج پورٹ پر جا کر مچھلیاں پکڑیں گے۔ سب مچھلیاں پکڑیں گے۔ ویزاک سمندر ہے۔ موج ہے۔ کنارہ ہے۔ راستہ میں بارش کا پانی بہہ رہا تھا۔ تو فرمایا۔ پانی بہہ رہا ہے۔ پھر کسی سے دریافت کیا۔ اس موٹر کا ڈرائیور کون ہے۔ ویزاک پہنچ کر دو ایک گھروں میں قیام فرمایا۔ پھر ساحل سمندر سے گزرتے ہوئے واپس لوٹے۔ لائٹ ہاؤس کے قریب ایک جہاز لنگر انداز تھا۔ وزیری کُتا اس سفر میں ساتھ نہ تھا۔ سُنا ہے پیچھے کافی روتا رہا۔ اب ایک نیا روسی نسل کا کتا بابا جان کے دربار میں پیش ہوا ہے اور دو بلیاں واپس کر دی گئیں ایک ایرانی اور ایک سیامی۔ اور ان کی نگرانی کسی اور کے سپرد کر دی گئی۔ ویزاک سے واپسی پر فرمایا دریا کو کیسے دیکھیں اندھیرا ہے۔ ودیانگر کے قلعہ کے قریب فرمایا۔ قلعہ نزدیک آگیا۔ چراغاں ہو رہا ہے۔ یہ باتیں اپنی اپنی جگہ پر رموز سے پُر ہیں۔ مگر یہ موتی وہی خوش نصیب چُنتے ہیں جو ہر ادا پر مر مٹتے ہوں اور جن کے دل، ہر عمل، ہر گفتار پر آمنا صدّقنا کہنا جانتے ہوں۔

۲۷ ستمبر کو پاکستان والوں کی واپسی تھی۔ آج تو حضور دربار میں بار بار ہی تشریف لاتے رہے۔ کرسی پر بٹھا کر لوگ لاتے۔ سب کو دیدار دکھاتے اور پھر واپس تشریف لے جاتے۔ یہ سلسلہ دن بھر جاری رہا۔ شام کو رخصت کے وقت سلام پڑھا گیا۔ اس وقت بابا جان کی نگاہوں کا یہ انداز تھا کہ عمر بھر ایسا نہ دیکھا گیا تھا۔ یہ رخصت ہو بھی چکی۔ تب بھی نو بجے شب دربار میں تشریف لے آئے اور ہر ایک پر ایک نگاہ ڈال کر فرمایا۔ چلا جاتا ہوں۔

آج صبح دربار کا عجب رنگ تھا۔ قلندر یہ شاہی لباس زیب تن تھا اور مجمع عالم کو شرفِ زیارت اور قدمبوسی عطا فرما کر جب حضور واپس چلے تو چھوٹے چھوٹے خوش پوش بچے، رنگین تیر و کمان لئے دور ویہ کھڑے ہو کر جے جے کے نعرے لگاتے رہے۔ سبحان اللہ، کیا نقشہ۔ کیا کیفیت، کیا رنگ اس میں تھا۔ جے ہو۔ اس سے زیادہ سرخروئی سے واپسی کی تصدیق زائرین کو اور کیا مل سکتی ہے۔ اس سے زیادہ اور کیا اُمت کے لئے پیامِ نصرت دیا جاسکتا تھا۔ ان ہی نشانیوں میں ایسی ہزار نشانیوں میں انسان حق کا جلوہ دیکھتا ہے۔ اور حق کے رمز سمجھ کر ایمان پختہ کرتا جاتا ہے۔

دربار کے درودیوار، ستون، تخت کے اوپر لگی ہوئی لالٹین دربار میں پالے ہوئے جانور، دربار کے علاقہ میں لگے ہوئے درخت تمام کے تمام رموز سے پُر ہیں۔ ہر چیز تقریباً نشانی ہے کسی چیز کی۔ یہ نشانیاں کچھ تو دائم قائم ہیں۔ کچھ بدلتی رہتی ہیں۔ انسان

خود آیتہ اللہ ہے۔ مگر پہنچے تو اس مقام تک اپنی حالت بدل کر دل کے راستے۔ یہ باتیں نہ عقل کے میدان کی ہیں۔ نہ عقل کی رسائی ان حدود میں ہے۔ عشق جاگے، دل کی دنیا میں اُتریں تو محبوب کی ہر ادا میں رنگینی پائیں گے۔ پھر جب محبوبیت میں اکملیت ہو تو سوائے حق کی کھلی ہوئی کتاب کے اور کچھ نظر نہ آئے گا۔ مادی چیزوں کے پیچھے نگاہ دوسرے ہی رمز دیکھنے لگے گی۔ قرآن کے الفاظ ہماری نشانیوں پر غور کرو بے معنی بات نہیں۔

علالت:۔

۷ اکتوبر ۶۰ء کو بائیں جانب فالج کا حملہ ہوا۔ دسمبر تک ہاتھ تو ٹھیک ہو گیا۔ مگر علاج معالجہ وہی فقیری شان والا ہوتا رہا۔ کبھی تھوڑا افاقہ ہو جاتا۔ کبھی پھر وہی ناسازی طبع لطافت کی منازل انسانی فہم و ادراک سے طبق در طبق اوپر ہوتی ہیں۔ فقیر مکمل قدرت رکھنے کے بعد اگر آئینہ دار ہوتا ہے تو عالم کے احساسات اور جذبات کا۔ جن ہستیوں کا رجوع عروج کی طرف ہو ان کے پائوں زمین پر جمائے رکھنا صرف صادق مریدین کی قلبی کیفیت سے ہی ہو سکتا ہے۔ یا دُکھے ہوئے دلوں کی دادرسی کرانے میں، یا اُمت کا بوجھ اُٹھائے رکھنے میں۔ مخلوق میں پھیلا کر۔

ایک دن بابا جان اندر آرام فرما رہے تھے کہ ایک فقیر صاحب دربار میں تشریف لائے۔ فرمایا ناگپور سے آیا ہوں۔ مجاور عبدالشکور صاحب کو بتایا۔ بیٹا کسی کو بتانا نہیں۔ اسی طرح بھیس بدل کر دربار شاہی میں پہنچنا ہوتا ہے۔ کچھ تحفے ساتھ لائے تھے۔ فرمانے لگے اگر شہنشاہ سو رہے ہوں تو کیلے کے گیل پلنگ کے نیچے رکھ دینا۔ اور یہ دو گلاب کے پھول پائوں میں رکھ دینا۔ خادم یہ چیزیں اندر لے کر پہنچے تو دیکھا کہ بابا جان بیٹھے ہوئے ہیں۔ واقعہ عرض کیا تو فرمانے لگے کہ وہ ایک عاشق اور خدا پرست ہے۔ یوں ایک دن قبل بابا جان بتا بھی چکے تھے کہ کل دربار میں شیر آئے گا۔ ان فقیر صاحب سے ملاقات کرنے بابا جان سہارا لے کر باہر تشریف لے آئے تو ان صاحب نے بابا جان کی قدمبوسی کی اور جب بابا جان رخصت ہونے لگے تو یہ فقیر صاحب ہاتھ کا سہارا دے کر گھر کی ٹیٹوں تک پہنچانے لگے اور بلائیں لیں۔ بابا جان اندر تشریف لے گئے تو ان فقیر صاحب نے مجاور صاحب سے فرمایا۔ محبت تجھ کو زیادہ ہے، رومت۔ صبر کر۔ کبھی کبھی اپنے ہاتھ سے دیا کر۔ شہنشاہ کا یہ آخری وقت ہے۔ جسم میں خون نہیں ہے۔ یہ فقیر صاحب مجاور صاحب کو اپنی چائے کی پیالی بھی دے گئے تھے۔ اور مجاور صاحب کافی عرصہ مجذوبیت کی حالت میں رہ کر بالآخر اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

آخری ایّام:

انسانی دسمبر ۶۰ء کے پہلے ہفتہ میں جمعرات کو بخار چڑھا۔ جمعہ کو اتنا شدید رہا کہ قبلہ عالم بیہوش رہے۔ سینچر کو کچھ آرام ہوا تو وہی رحمت کا جوش کہ اتوار کو کرسی پر برآمدہ میں لوگوں نے بٹھایا اور حضور نے پروانوں کو دیدار دیا۔ لوگوں نے عرض کی ابھی تشریف نہ لے جائیں۔ شان کے واسطے دیئے۔ دور دراز کے لوگوں کے واسطے دیئے کہ سب حضور کی صحت کے لیے بے چین ہیں تو فرمایا جو حالت دیکھ رہے ہو وہی لکھ دو۔ خادموں نے رونا شروع کیا تو خود بھی متاثر ہوئے مگر فرمایا۔ میں رہ کر کیا کروں۔ جو کچھ رہ کر کرتے ہیں وہی پس پردہ بھی ہوتا رہے گا۔

دوسری صبح کو حضور نے تین بکرے کٹوا کر غریبوں کو کھانا کھلایا کہ یہی سب سے مرغوب مشغلہ تھا۔ دربار میں کرسی پر بیٹھ کر تقریباً روزانہ ہی تشریف لانے لگے۔ کچھ خادموں نے جانے کی اجازت طلب کرنی شروع کر دی۔ تو حضور کو یہ بات پسند نہ آئی۔ محبت بھرا دل جدائی کب گوارہ کر سکتا ہے۔ کچھ دن میں بیماری نے زور پکڑا۔ سارے بدن میں درد رہنے لگا۔ منہ پک گیا۔ بلغم کے ساتھ خون آنے لگا مگر طالبان کا ہر وقت خیال رہتا۔ حضور نے بار بار فرمایا۔ ہم پاکستان جا کر آئیں گے۔ مچھلی ملتی ہے کیا۔ جب تک مچھلی نہ ملے گی میں سر کے بال نہ اُتاروں گا۔

جنوری ۶۱ء آگیا۔ دربار کے لوگ آپس میں رنجشیں کر کے علیحدہ ہونے شروع ہوئے۔ اور ادھر بیماری میں اُلٹ پھیر جاری رہی۔ نازک دلوں کی محبت کا نازک قلب ہی کو اندازہ ہو سکتا ہے۔ اپنے بچوں کی جدائی کیسے برداشت ہو سکتی ہے۔ ان ہی ایّام میں علیحدہ علیحدہ کچھ خادموں کی بشارتیں سُن کر بابا جان نے فرمایا۔ پاکستان جا کر تمہیں رسولِ خدا کا دوبارہ دیدار ہو گا تو یہ کہنا کہ پہلے تو اسے دیکھ لیا پھر دوسری دفعہ تمہیں۔ یہ بات بھولنا نہیں ہے۔ کہنا ہے۔ یہ بھی فرمایا۔ ایک چھپا رستم ہے جس نے تمہاری چیز دبا رکھی ہے۔ جیسا جیسا بتاتا جائے کرتے جائو۔ سینہ روشن ہوتا رہے گا۔ دین دنیا ملے گی۔

جنوری کے پہلے ہفتہ میں فرمایا۔ میٹھے پانی کا تالاب دریا بن گیا۔ میٹھا دریا اور کھاری دریا دونوں مل جائیں گے۔ بار بار اس زمانہ میں بھی اور اس کے بعد بھی فرمایا۔ پاکستان جائوں گا، عربستان جائوں گا، ناگپور جائوں گا۔

۹ جنوری ۶۱ء کو بخار کی شدت ہو گئی۔ پھر بھی دربار تشریف لائے۔ اور پھول معمول سے بہت زائد مقدار میں لوگوں کو دیئے۔ آج سے ہی مرض کی شدت بہت بڑھ گئی۔ اب زبان سے فرماتے ہوئے الفاظ کسی کی سمجھ میں نہ آتے تھے۔ یہ سلسلہ بیماری کا کچھ دن جاری رہا۔ دربار پھر تشریف نہ لا سکے۔

جمعرات ۲۶ جنوری کو ۱۱ بجے رات کسی خادم کو فرمایا۔ میں چلا جانا چاہتا ہوں۔ تم لوگ کھا پی کر خوش رہو گے۔ پھر ایک اور خادم کو بلوا کر فرمایا۔ مجھے مت روکو۔ پھر کسی اور سے فرمایا۔ اچھی طرح سب دربار کے انتظام چلتے رہیں گے۔ میں کہیں غائب نہیں ہوتا۔ صرف تم لوگوں کو نظر نہ آئوں گا۔

جمعہ ۲۷ جنوری ۶۱ء مطابق ۹ شعبان ۱۳۸۰ھ بھشما نیاکاوشی کے دن صبح ۵ بجے سے نازک حالت ہو گئی۔ سانس میں غرغر کی آواز آنے لگی۔ دن چڑھے گیس دی گئی تو کوشش کر کے فرمایا۔ مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ گیس کی نلکی ہٹا دی گئی۔ سوا بجے دوپہر کے وقت حضور نے رحلت فرمائی۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ

ہزاروں فدائی اطلاع ملنے پر جمع ہونے شروع ہو گئے۔ آبِ زمزم اور گلاب سے حضور نے غسل فرمایا اور ناگپور کا لہریا غلاف اوڑھ کر سنیچر کی ۳ بجے شام لال مٹے پر پانی بتائی ہوئی جگہ پر آرام فرمایا۔ لاکھوں سلام ان پر جو ظاہر میں بھی سراپا رحمت تھے اور پردہ میں بھی سراپا رحمت ہیں۔ نہ صرف بچوں کے لئے بلکہ دور دراز کے لوگوں کے لئے اور مخلوق عالم کے لئے۔ یہ روشنی اب دنیا عرصہ تک نہ دیکھ سکے گی۔ ایسی ہستیاں ہزار سال میں ہی آتی ہیں۔ خود بھی فرمایا تھا۔ میرے فوراً بعد ایک بزرگ اور آئیں گے۔ مجھ جیسا اب نہیں آتا۔ کوئی آیا بھی تو تین سو سال بعد۔ مگر یہ بات کہاں۔ ایک نہیں کئی ہستیاں شاہد ہیں کہ ایک دور دراز جگہ پر غائبانہ نمازِ جنازہ ادا کی گئی تو حضور خود موجود تھے۔ یوں نیازوں کے موقعوں پر بھی اور تنہائی میں بھی حضور کی زیارت لوگوں کو ہوئی ہے۔ اور بعض خوش نصیبوں کو معہ جسم کے۔ عام لوگ شاہد ہیں کہ پردہ کے بعد ان کی خواہشیں اب زیادہ پوری ہو رہی ہیں۔ نسبت پہلے کے۔

طالبان صادق جانتے ہیں یہ نور زیر زمین نہیں جاتا۔ فنا ہونے والی چیز فنا ہوتی ہے۔ بقا کو فنا کہاں۔ یبقٰی وجہ ربک جاری ساری ہے۔ یہ نور ازلی ایک بدن چھوڑ کر دوسری جگہ منتقل ہو جاتا ہے۔ اور مقید بھی نہیں ہوتا۔ نور کو نہ فنا ہے نہ اس کی تقسیم ہو سکتی ہے۔ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ ظاہر بھی وہی باطن بھی وہی اول بھی وہی، آخر بھی وہی۔

هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اَللّٰهُ الصَّمَدُ

آبروئے حیات ہیں یہ لوگ　　حاصلِ کائنات ہیں یہ لوگ

ایک کونے میں گو سما جائیں　　وسعتِ شش جہات ہیں یہ لوگ

زندگانی تو آنی جانی ہے　　زندگی کا ثبات ہیں یہ لوگ

ہیں یہ عرفان اور یہی وجدان　　قلب کی واردات ہیں یہ لوگ

بے سُنے مست بے کہے گویا　　لاکھ باتوں کی بات ہیں یہ لوگ

کامرانی کی انتہا پر بھی　　دل کی بازی سے مات ہیں یہ لوگ

دیکھ لیجئے وجود قادرؔ کو　　حق نما حق صفات ہیں یہ لوگ

(رحمن بابا)

تری تلاش میں دشتِ خیال تک پہنچے

جو قیل و قال سے گزرے تو حال تک پہنچے

کھٹک رہے تھے نگاہوں میں حُسن کے جلوے

دل و نگاہ سے گزرے جمال تک پہنچے

بلا کشانِ محبت کی مستیاں توبہ

مئے حیات سے کیفِ جلال تک پہنچے

جراحتوں سے تو بھرپور ہیں جگر سب کے

مزا تو جب ہے کوئی اندمال تک پہنچے

سراب عقل میں کھوئے گئے، ہنر والے

جو بے ہُنر تھے وہ کسب و کمال تک پہنچے

(رحمن بابا)

☆...☆...☆